اُمت کے فیصلے ،اُمت کے مشورے سے

ڈاکٹر محی الدین غازی

ترجمان القرآن: مارچ 2017ء

مسلم معاشرے،اسلامی ریاست اور مسلمانوں کی اجتماعیت میں شورائیت کو ضروری مان لینے کے بعد ایک بہت اہم بحث یہ ہوتی ہے، کہ شورائیت کے نتیجے میں اتفاق یا اکثریت سے سامنے آنے والی رائے کو سربراہِ ریاست اور امیر تنظیم کے لیے ماننا ضروری ہے، یا محض اسے سن لینا کافی ہے۔

شوریٰ اور مشورہ محض علامتی؟

مولانا مودودی لکھتے ہیں: ''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں مقننہ (اہل الحلّ والعقد) کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ محض صدرِ ریاست کی مشیر ہے، جس کے مشوروں کو رد یا قبول کرنے کا صدرِ ریاست کو اختیار ہے؟ یا صدرِ ریاست اُس کی اکثریت یا اُس کے اجماع کے فیصلوں کا پابند ہے؟ اس باب میں قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات باہمی مشورے سے انجام پانے چاہییں (وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ، الشوریٰ ۴۲:۳۸) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت صدرِ ریاست کے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے: وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ ج فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۹) ''اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو، پھر (مشورے کے بعد) جب تم عزم کرلو تو اللہ کے بھروسے پر عمل کرو۔

یہ دونوں آیتیں مشورے کو لازم کرتی ہیں، اور صدر ریاست کو ہدایت کرتی ہیں کہ جب وہ مشورے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو اللہ کے بھروسے پر اسے نافذ کردے۔ لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیتیں، جو ہمارے سامنے پیش ہے۔ حدیث میں بھی اس کے متعلق کوئی قطعی حکم مجھے نہیں ملا ہے۔ البتہ خلافتِ راشدہ کے تعامل سے علماے اسلام نے بالعموم یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نظمِ ریاست کا اصل ذمہ دار صدرِ ریاست ہے، اور وہ اہل حل و عقد سے مشورہ کرنے کا پابند ضرور ہے، مگر اس بات کا پابند نہیں کہ ان کی اکثریت یا ان کی متفقہ رائے پر ہی عمل کرے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو 'ویٹو' کے اختیارات حاصل ہیں''۔۲۱

تاہم، تفہیم القرآن میں مولانا مودودی اس رائے سے رجوع کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے، یا جسے ان کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو

مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرمارہاہے کہ ''ان کے معاملات میں ان سے مشورہ لیاجاتاہے'' بلکہ یہ فرمارہاہے کہ ''ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں''۔اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو،اسی کے مطابق معاملات چلیں'' ۔ ۲۲

اسی طرح ڈاکٹر علی صلابی بعض معاصر علما کا حوالہ دیتے ہوئے پورے شد و مد کے ساتھ امیر کو شوریٰ کی رائے کا پابند قرار دیتے ہیں۔وہ ایک طرف اسے فطرت اور عقل و قلب کی آواز بتاتے ہیں اور دوسری طرف دلائل شریعت کا تقاضا بھی قرار دیتے ہیں۔ان کے بقول شوریٰ کا پابند کر کے ہی امیر کو استبداد اور مطلق العنانی (Dictatorship) سے باز رکھا جاسکے گا۔اس موقف کی تائید میں وہ حیاتِ رسولؐ کی ان بعض نظیروں کو بھی پیش کرتے ہیں، جب اللہ کے رسولؐ نے لوگوں کی رائے سامنے آجانے کے بعد اپنے موقف سے رجوع فرمالیا۔ڈاکٹر صلابی کا کہنا ہے کہ امیر امت کا ایک فرد ہوتا ہے، اور فرد کی رائے کے مقابلے میں امت کی رائے کا صحیح تر ہونا بہر حال زیادہ قرین قیاس ہے۔ایک فرد کی رائے میں غلطی کے جس قدر امکانات ہوتے ہیں، ایک بڑے گروہ کی رائے میں وہ امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔شوریٰ کی رائے کو لازمی قرار دینے کا صرف اگر ایک یہی فائدہ حاصل ہوتا ہو کہ اس طرح مطلق العنانی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے تو یہ اپنے آپ میں ایک طاقت ور دلیل ہے۔ ۲۳

دراصل آیت شوریٰ کے الفاظ اسی دوسری رائے کی تائید کرتے ہیں، کہ جب معاملے کا تعلق سب سے ہو تو ایک فرد کو محض اپنی صواب دید سے کوئی فیصلہ کر لینے کا اختیار نہیں دیا جاسکتا ہے۔اگر معاملہ حاکم یا امیر کا ذاتی ہو تب تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ جن لوگوں کو اہل الرائے اور قابل اعتماد سمجھتا ہو ان سے مشورہ لے اور اس کی روشنی میں پوری آزادی کے ساتھ فیصلہ کرے، کیونکہ معاملہ اس کا ذاتی ہے۔تاہم، اگر معاملہ اس کا ذاتی نہیں بلکہ امت اور اجتماعیت کا ہو، اور ہونے والے فیصلے کا راست اثر امت اور پوری اجتماعیت کے افراد پر ہوتا ہو، تو ایسی صورت میں وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ پر عمل کیا جائے گا، اور امت یا امت کے نمایندوں سے مشورہ لیا جائے گا، اور وہ جس رائے تک پہنچیں گے اسی کو لازمی طور سے اختیار کیا جائے گا۔

شَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ سے تو ایسی کوئی گنجایش نکل سکتی تھی، کہ حکم مشورے میں شریک کرنے کا ہے، مشورے کو مان لینے کا نہیں ہے، لیکن اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ کا تقاضا تو یہی ہے کہ جو بھی فیصلہ ہو وہ شورائی عمل کے ذریعے ہی وجود میں آئے۔اس میں کہیں بھی کسی ایک فرد کی رائے کو سب کی رائے پر محض اس وجہ سے برتری حاصل نہ ہو کہ وہ کسی امیر کی رائے ہے یا کسی بزرگ کی رائے ہے، کیونکہ آیت میں زور افراد پر نہیں بلکہ معاملے پر ہے، کہ وہ افراد کی باہمی مشاورت سے فیصل ہوتے ہیں۔اگر افراد مشاورت میں شریک ہوں لیکن معاملات کسی کی ذاتی رائے سے فیصل ہوتے ہوں تو یہ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ نہیں ہے۔

شورائی عمل میں عورت کی شرکت

مشاورتی عمل میں خواتین کی شرکت کے حوالے سے مولانامودودی کہتے ہیں کہ ایک اسلامی ریاست میں عورتوں کو بھی حقِ رائے دہی حاصل ہوگا۔ اگرچہ نام نہاد متمدن ممالک میں تو عورتوں کو یہ حق بہت بعد میں حاصل ہوا، لیکن اسلام نے توآغاز ہی میں انھیں یہ حق تفویض کر دیا تھا۔۲۴

تاہم، بعض معاصر علماخواتین کی شورائی عمل میں شرکت اوراس کے لیے تشکیل کردہ مجالس شوریٰ کی رکنیت کی بھرپور وکالت کرتے ہیں۔علامہ علال فاسی: فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا (البقرہ۲۳۳:۲) سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب چھوٹے خاندان کی سطح پر عورت سے خاندانی امور میں مشورے کو مطلوب قرار دیا گیا ہے، تو بڑے خاندان، یعنی امت اور ریاست کی سطح پر آدھے خاندان (خواتین) کو شورائیت کے حق سے کیسے محروم رکھا جاسکتا ہے۔ ۲۵

ڈاکٹر علی صلابی نے خواتین کی شورائی عمل میں شرکت کے حق میں حیاتِ رسولؐ اور خلافت راشدہ کی عملی نظیریں پیش کی ہیں، جن سے خواتین کا ریاست کے امور میں مشورے دینا، اوران مشوروں کو قابل لحاظ مقام دیا جانا معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور سے خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے بارے میں اس کا خاص اہتمام منقول ہے۔۲۶

ڈاکٹر علی صلابی نے ایک لطیف استدلال کرتے ہوئے بتایا کہ قرآن مجید میں عورت کا مشورہ کرنا بھی مذکور ہے اور مشورہ دینے کا بھی تذکرہ ہے۔ مشورہ مانگنے کی مثال سورۂ نمل (۲۹-۳۵) میں مذکور ملکۂ سبا کا واقعہ ہے، جس میں ملکہ سبا نے حضرت سلیمانؑ کے پیغام کے تعلق سے اپنے درباریوں سے مشورہ مانگا تھا، جب کہ مشورہ دینے کی مثال سورۂ قصص کی آیت ۲۶ میں مذکور وہ واقعہ ہے جب دو بہنوں میں سے ایک نے اپنے والد کو حضرت موسیٰ کی خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ قرآن مجید میں مذکورہ دونوں واقعات اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں کہ شارع کی رضامندی ظاہر ہوتی ہے۔۲۷

البتہ خلافت کا وہ وصف جو مولانامودودی کے بقول ہر مسلمان کو کارِ جہانبانی میں شریک ٹھیراتا ہے، اس وصف میں مرد اور عورتیں برابر کی شریک ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں: ''ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہیے، اس لیے کہ وہ خلافت [vicegerency] کا حامل ہے۔ خدا نے اس خلافت کو کسی خاص معیارِ لیاقت یا کسی معیارِ ثروت سے مشروط نہیں کیا ہے، بلکہ صرف ایمان و عمل صالح سے مشروط کیا ہے۔ لہٰذا رائے دہی میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہے''۔۲۸

عورت کے حق رائے دہی کے سلسلے میں بنیادی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی جہاں تعلیم دی ہے، وہاں عورت مرد کی کوئی تفریق نہیں کی ہے، بلکہ جن اوصاف کے درمیان شورائیت کے وصف کا تذکرہ کیا ہے، ان میں سے کوئی بھی وصف مردوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ پھر خلفائے راشدین میں حضرت عمرؓ کے بارے میں تو صراحت سے ملتا ہے کہ وہ عورتوں سے مشورہ لیتے تھے اور ان کی رائے قبول بھی کرتے تھے۔۲۹

غیر مسلموں کی شورائی اداروں میں شرکت

گو کہ آیت شوریٰ سے اس طرح کی کوئی بات ثابت نہیں کی جاسکتی، کیونکہ آیت شوریٰ میں مسلمانوں کا ذکر ہے، تاہم بعض دوسری دلیلوں کا سہارا لے کر بعض جدید اسلامی مفکرین نے اسلامی ریاست کی مجالس شوریٰ میں غیر مسلموں کی رکنیت کی وکالت کی ہے۔ ڈاکٹر علی صلابی اسی موقف کے حامی ہیں، اور انھوں نے اپنی تائید میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی اور ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کا حوالہ دیا ہے۔ ۳۰

اقلیتوں کے حوالے سے مولانا مودودی کی رائے ہے کہ: ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے صاحبِ امر بننے کی گنجایش نہیں ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک اشتراکی ریاست میں منکرین اشتراکیت اور ایک جمہوری ریاست میں مخالفین جمہوریت کے لیے اولی الامر بننے کا نہ عقلاً کوئی موقع ہے اور نہ عملاً۔ مشاورتی عمل میں غیر مسلموں کی شرکت کے حوالے سے وہ وضاحت کرتے ہیں: ''کسی بھی جمہوری ریاست میں سیاسی اقلیت عارضی ہوتی ہے۔ لیکن بعض اقلیتوں کی بعض اقسام مستقل ہوتی ہیں، مثلاً: نسلی، ثقافتی، مذہبی وغیرہ۔ مستقل اقلیت ہونا ایک حقیقی مسئلہ ہے۔ ضروری ہے کہ اس کا کوئی قابل اطمینان آئینی حل نکالا جائے تاکہ وہ شہریوں کی حیثیت سے اپنے حقوق سے محروم نہ کیے جائیں۔ اقلیتوں کے منتخب ارکان، پارلیمان کے رکن بن سکتے ہیں، تاکہ وہ اپنے حقوق کا تحفظ کر سکیں'' ۔۳۱

اگر کسی فیصلے کا تعلق براہِ راست غیر مسلموں سے ہو تو ان سے مشورہ لینے کی تائید ائمہ سلف کے یہاں ملتی ہے۔ اس کی مثال ابو عبید نے یہ دی ہے کہ اگر کسی قلعے کا مسلمانوں نے محاصرہ کر لیا، اور قلعے کے سردار صلح کے لیے راضی ہوں تو اس پیش کش پر اس وقت تک عمل نہ کیا جائے جب تک کہ قلعہ کے بقیہ لوگوں کی رائے بھی معتبر ذرائع سے معلوم نہیں ہو جاتی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی یہی ہدایت تھی۔ ۳۲

شورائیت کے باب میں انسانی کوششوں سے استفادہ

شورائیت کے زریں اصول کو بہتر عملی جامہ عطا کرنے کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ کتاب وسنت اور امت کے موجود فکری سرمایے سے استفادہ کیا جائے، وہیں عقلِ انسانی کی کاوشوں سے فائدہ اٹھانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

شورائیت کا اصول چوں کہ انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، اور انسانوں کی بہت ساری دریافتیں وحی و فطرت کے مطابق ہوتی ہیں۔ ریاستی اُمور چلانے کے لیے انسانی کوششوں سے استفادہ کے ذیل میں جمہوری طریقۂ انتخاب اور طرزِ حکومت کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ یاد رہے جمہوریت کا ایک پہلو نظریاتی بھی ہے، جس کا سب سے زیادہ قابل اعتراض حصہ حاکمیتِ جمہور ہے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ مملکت کا نظریہ اور عقیدہ تو اسلام ہو، قانون سازی کے لیے اصل رہنما اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآنِ کریم ہو، تاہم حکومت بنانے اور چلانے کے لیے بطور نظام وہ طریقے اختیار کیے جائیں، جن کو انسانی ذہن

نے ایک طویل سفر اور بے شمار تجربات کے بعد دریافت کیا ہے۔انسانوں نے اس نظام کو نام جمہوری طرز حکومت کا دیا ہے۔اس نظام کے بہت سارے پہلو اسلامی تعلیمات سے متصادم بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ان میں ترمیم واصلاح کر کے اگر اختیار کیا جائے تو شورائیت کے تقاضوں کے مطابق حکومت چلانے کے لیے وہ نظام موزوں بھی ہو سکتا ہے۔

آمریت زدہ کلچر اور مزاج کے زیر سایہ ماضی قریب کے تلخ تجربات سے گزرنے کے بعد اب اسلامی تحریکات اور علما نے ایسی بہت سی انسانی دریافتوں کی تحسین کی ہے، جو راقم کے نزدیک کسی مرعوبیت کا نتیجہ نہیں بلکہ تلاشِ حکمت کے تحت ہے۔تاحیات امیر کے تصور کے بجائے اب مختلف اسلامی تنظیموں کے دساتیر میں یہاں تک شامل کیا گیا ہے، کہ امیر کے لیے ایک دورانیہ ہوگا،اور کوئی شخص ان دورانیوں سے زیادہ امارت کے لیے منتخب نہیں کیا جاسکے گا۔

رائے شناسی کے لیے رائے شماری ضروری ہے

جمہوریت پر تنقید کرتے ہوئے علامہ محمد اقبال کا ایک شعر اکثر ذکر کیا جاتا ہے

جمہوریت اِک طرز حکومت ہے کہ جس میں

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اس تنقید کا کیا مطلب ہے،اور علامہ محمد اقبال کے ذہن میں انسانوں کو گننے کے بجائے تولنے کا کیا ممکن طریقہ موجود تھا؟اس سے قطع نظر،انسانوں کی خواص اور عوام میں تقسیم اور ان کے درمیان یہ تفریق کہ فلاں کی رائے قابل اعتبار ہو اور فلاں کی نہ ہو، فتنوں کا نیا دروازہ کھولتی ہے۔

دوسری جانب یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں رائے دہی اور رائے شماری کا شفاف اور دیانت دارانہ انتظام ہو،اور جہاں ہر ایک کو سوچنے اور اپنا خیال ظاہر کرنے کی پوری آزادی ہو، وہاں وزنی رائے رکھنے والوں کو اپنی رائے دوسروں تک پہنچانے اور اپنی رائے کا وزن منوانے کا پورا موقع حاصل ہوتا ہے۔ گویا لوگوں کو تولنے کے لیے سازگار ماحول وہیں بنتا ہے جہاں سب کو رائے دینے کا یکساں حق ہو اور جہاں سب کی رائے یکساں طور پر شمار کی جائے۔سب کی رائے کو رائے شماری کے وقت یکساں وزن دینے سے واقعاتی سطح پر ایسا ہو سکتا ہے کہ کبھی کسی غلط رائے کو اکثریت حاصل ہو جائے،اور وہ محض کثرت رائے کی بنیاد پر مان لی جائے۔ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس طریقے پر عمل پیرا ہونے سے کبھی امت کے بعض مصالح متاثر ہو جائیں، لیکن اس رویے سے احتراز کے نقصانات زیادہ شدید ہوتے ہیں۔

کسی بھی اجتماعی معاملے میں آخری فیصلہ بہر حال رائے شماری کے ذریعے ہو، یہی اَمرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ کی تعلیم ہے، اور یہی احترام انسانیت کا تقاضا ہے۔ اَلْعَوَامُ کَالْاَنْعَامِ ایک خراب اور ناپسندیدہ صورت حال کی تعبیر ہے، جو شہنشاہی نظام کے تحت رہتے رہتے وجود میں آئی ہے۔ یہ کوئی حکیمانہ اصول نہیں ہے کہ جس کی بناپر کسی نظام کی تشکیل ہو۔ ضرورت اس صورت حال اور اس طرزِ فکر کو بدلنے کی ہے، نہ یہ کہ اس کو قبول کر کے اسے ایک اساس کی حیثیت دے دی جائے۔

نمایندگی شورائیت کے لیے معاون، اس کا بدل نہیں

شورائیت کے اصول کا تقاضا یہ ہے کہ ہر فرد اپنے حاصلِ غور و فکر کو لوگوں تک اور بطورِ خاص فیصلہ ساز اداروں تک پہنچانے کے بھرپور مواقع رکھتا ہو۔ لیکن جہاں صاحبِ معاملہ افراد کی تعداد زیادہ ہو اور سب کو براہِ راست مشورے میں شریک کرنا ممکن نہ ہو، وہاں ضرورت کے تقاضے کے تحت نمایندگی کے اصول کو اختیار کیا جاتا ہے۔ نمایندگی کا مقصد شورائی عمل کو ممکنہ حد تک فعال بنانا ہوتا ہے۔ لیکن بسا اوقات نمایندگی شورائی عمل میں معاون ہونے کے بجائے خود اس راہ کی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ نمایندے غور و فکر کے اجارہ دار بن کر پوری قوم کو غور و فکر کے عمل سے محروم کر دیتے ہیں۔ ایسے نمایندوں کے غور و فکر کو پوری قوم کے غور و فکر کا بدل سمجھ لینا، اور نمایندوں کی مشاورت کو وہ حیثیت دے دینا کہ پوری قوم مشاورت کی ذمہ داری سے بالکل کنارہ کش ہو جائے، مثالی رویہ نہیں ہے۔

اگر مشاورت کا مقصد بہتر رائے تک پہنچنا ہے تو اس کے امکانات کم نہیں ہوتے کہ نمایندہ افراد سے زیادہ بہتر رائے تک وہ افراد پہنچ جائیں جو نمایندہ نہیں ہیں۔ ایسے افراد کی رائے کو بے وزن ہونے سے بچانا اور غیر نمایندہ افراد کی قیمتی آرا کو نمایندہ افراد کی رائے کی طرح قانونی اعتبار عطا کرنا، تمدنی سفر کا ایک اہم ہدف ہونا چاہیے۔ نمایندگی کو مستقل اور مثالی حکمتِ عملی کے بجائے وقتی اور عبوری حکمتِ عملی قرار دے کر ایسے نظام کے امکانات پر غور کرنا چاہیے، جہاں ہر فرد براہِ راست مشاورت کے عمل میں حصہ لے اور جہاں اَمرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ کی ذمہ داری سب ادا کریں اور اس کی برکتوں سے پورا معاشرہ فیض یاب ہو سکے۔

اہل حل و عقد کی اصطلاح ؟

فقہ اور اسلامی سیاست کی کتابوں میں 'اہل حل و عقد' کی اصطلاح کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔ یہ اصطلاح اسلام کے سیاسی نظام کی ایک اہم بنیاد ہے، اور امت کا مطلوبہ شورائی نظام اہل حل و عقد کے توسط سے چلتا ہے۔ اس اصطلاح پر ڈاکٹر حاکم مطیری کا درج ذیل تبصرہ غور طلب ہے: شوریٰ سب کا حق ہے، اس پر کسی کا بھی خواہ وہ کوئی بھی ہو، دوسروں سے زیادہ حق نہیں بنتا ہے۔

فقہ اور احکام سلطانیہ کی کتابوں میں موجود اہل حل و عقد کی اصطلاح صحابہ کے درمیان معروف نہیں تھی۔ عہد نبوت اور عہد خلافت راشدہ میں مشاورت سب کے لیے عام تھی۔ اہل حل و عقد کی اصطلاح عباسی دور میں ایجاد ہوئی۔ پھر اہل حل و عقد کے سلسلے میں ایسی شرطیں رکھی گئیں جو شاذ و نادر کسی میں پائی جائیں، اور جن کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس طرح سب کے مشورے سے امیر کے انتخاب کا جو بہت بنیادی حق امت کو دیا گیا تھا، اس حق سے امت کو یہ کہہ کر محروم کر دیا گیا کہ ''یہ تو اہل حل و عقد کے دائرہ اختصاص میں آتا ہے''۔ پھر زوال اور کمزوری کے زمانوں میں امت کا حال یہ ہوا کہ خلیفہ اور سلطان ہی اپنی صواب دید اور اپنی پسند کے تحت 'اہل حل و عقد' کا تعین کرنے لگا، اور تعین بھی ان لوگوں کا کیا جاتا جو نہ قوت فیصلہ رکھتے، نہ جرأت اظہار کی دولت رکھتے، البتہ وہ لوگ اس مجلسِ حل و عقد کے رکن بنتے یا بنائے جاتے، جو امت کے لیے بے سود اور خلیفہ کے لیے بے ضرر ہوتے۔ ۳۳

شورائیت اور انصاف کے تقاضے

بسا اوقات شورائیت کے تقاضوں اور انصاف کے تقاضوں میں باہم تعارض در پیش ہوتا ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ ایسا نظام لایا جائے جس میں دونوں تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں جب اسلامی تاریخ کے پہلے خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ زیر بحث آیا، تو اسلامی امت کے اندر موجود ایک تقسیم ابھر کر سامنے آئی، جو انصار اور مہاجرین کی تھی۔ انصار کی طرف سے مطالبہ آیا کہ: مِنَّا أَمِيرٌ وَمِنْكُمْ أَمِيرٌ'' ایک امیر ہم سے ہو اور ایک تم میں سے ہو''۔ ۳۴ اگر اس تقسیم پر وہ اصرار کرتے تو وہ مطالبہ مبنی بر انصاف تھا، لیکن اکابر صحابہؓ نے اس تقسیم کو ذہن سے نکال کر امت کے عمومی تصور کو پیش کیا جس میں ایسی کسی تقسیم سے بالاتر ہونا تھا۔ جس کے بعد سب نے مل کر ایسی شخصیات کی تلاش شروع کی، جن کا انتخاب پوری امت کے مفاد میں ہو۔ یہ امرِ ربی تھا کہ وہ سب شخصیات، یعنی خلفاے راشدینؓ، مہاجرین میں سے تھے، لیکن ان کا انتخاب دونوں گروہوں کی مرضی سے ہوا تھا۔

اگر تقسیم ایسی ہو، جس کو نظر انداز کرنا اور اس سے اوپر اٹھنا ممکن ہو، تو یہی مثالی کیفیت ہے۔ لیکن اگر کسی معاشرے میں موجود کوئی تقسیم ایسی شکل اختیار کرلے کہ اس کو نظر انداز کرنا ممکن نہ ہو، تو جب تک وہ تقسیم ختم نہیں ہو جاتی ہے، اس کو ایک واقعہ مان کر ایسا شورائی نظام تشکیل دیا جائے، جس میں شورائیت کے تقاضوں کے ساتھ معاشرے کے تمام گروہوں کے ساتھ انصاف کے تقاضے بھی ادا ہو سکیں۔

اگر کوئی گروہ مِنَّا اَمِیرٌ کا مطالبہ رکھتا ہو، تو امارت کے انتخاب کا ایسا نظام ضرور ہونا چاہیے، جس میں ہر ایسے قابل لحاظ گروہ کے مطالبے کی رعایت ہو سکے، اور معاشرے کے کسی گروہ کو محرومی کا احساس نہ رہے۔

ایک اہم مسئلہ

کسی ایک علاقے کے مسلمانوں کے مشورے سے اگر ایک شخص امیر بنتا ہے تو وہ صرف اس علاقے کے لوگوں کا امیر قرار پائے گا، یا دنیا کے سارے مسلمانوں کے لیے اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا ضروری ہو گا؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس کی تحقیق ضروری ہے۔ شورائیت کا تقاضا تو یہی لگتا ہے کہ جس علاقے کے لوگ جسے امیر بنادیں وہ اس علاقے کا ہی امیر قرار پائے، لیکن اشکال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ کیا بیک وقت عالم اسلام میں متعدد 'خلیفہ' اور 'امیر المومنین' ہو سکتے ہیں؟ خلافتِ راشدہ کے دور میں اس کی مثال نہیں ملتی، بعد کے ادوار میں بعض مثالیں ملتی ہیں، لیکن وہ مثالیں دلیل کا درجہ نہیں رکھتی ہیں۔ یہ مسئلہ حالیہ واقعات کے تناظر میں بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ تصور کہ کیا ایک علاقے کے مسلمانوں کا امیر، دوسرے سارے مسلمانوں کو بذریعۂ شمشیر اپنی بیعت پر مجبور کر سکتا ہے، یا کم از کم انھیں دائرہ امت سے خارج سمجھا جائے جو اس کی بیعت سے انکار کردیں، ایک بڑا ہی خطرناک تصور ہے اور شورائیت کے اصول سے براہِ راست متصادم ہے۔

راقم کو احمد ریسونی کی اس بات سے اتفاق ہے کہ: ''اگر 'خلافت' اور 'خلیفہ' کا لفظ مسلمانوں کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جائے تو ان کے دین میں ذرہ برابر کمی نہیں آئے گی، لیکن اگر محض ایک دن کے لیے عدل روپوش ہو گیا، شورائیت کو دیس نکالا دے دیا گیا اور آئین کی پاس داری کو پامال کر دیا گیا، تو یہ سب سے بڑی مصیبت ہو گی۔''

حرفِ آخر

جن اسلامی ملکوں میں غیر شورائی بلکہ آمرانہ نظام عرصہ دراز سے نافذ ہے، وہاں آمریت کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے، کہ: ''معاشرہ تمدنی لحاظ سے بالغ اور جمہوری طرزِ حکومت کے لیے تیار نہیں ہوا ہے، اور اگر امور مملکت عوام کے حوالے کر دیے گئے، تو پورا ملک بدترین قسم کے انتشار واختلاف سے دوچار ہو جائے گا، اور اس کا اندیشہ ہے کہ غلط قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آجائے، جو ملک کو تباہی کے راستے پر لے جائیں گے۔''

ڈاکٹر طہٰ جابر علوانی کے بقول: ''ان شاطر اور سرکش حکمرانوں نے امت کو یہ باور کرایا ہے، کہ امت نابالغ یتیم بچے کی طرح ہے جسے ایک سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے، اور ایسا سرپرست وہ خود ہیں۔ یتیم فرد تو کبھی بالغ بھی ہو جاتا ہے، تاہم یہ امت وہ 'یتیم' ہے جو ہمیشہ 'نابالغ' رہے گی اور ایسے سفاک، لالچی اور خود پسند سرپرست کی ضرورت مند رہے گی۔ یہ غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈا سرکش حکمران ٹولے کے علاوہ ان کے حاشیہ بردار علما اور دانش ور بھی کرتے ہیں۔''

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ''مولانا مودودی نے اس موضوع پر جمہوریت کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے وہ بڑی فکر انگیز ہے۔ مولانا لکھتے ہیں: ۔ جمہوریت میں بھی بہت سے نقائص ہوتے ہیں، اور وہ نقائص بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں، جب کہ کسی ملک کی آبادی میں شعور کی کمی ہو، ذہنی انتشار موجود ہو، اخلاق کمزور ہوں، اور ایسے عناصر کا زور ہو، جو ملک کے مجموعی مفاد کی بہ نسبت اپنے ذاتی، نسلی، صوبائی، اور گروہی مفاد کو عزیز تر رکھتے ہوں۔ لیکن، ان سب حقائق کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی یہ عظیم تر حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ ایک قوم کی ان کمزوریوں کو دور کرنے اور اسے بحیثیت مجموعی ایک بالغ قوم بنانے کا راستہ جمہوریت ہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان اسی وقت اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے، جب کہ اسے اپنے اختیار سے کام کرنے اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھالے کا موقع حاصل ہو۔ آغاز میں اس کے اندر بہت سی کمزوریاں ہوتی ہیں، جن کی بنا پر وہ ٹھوکریں کھاتا ہے، مگر تجربات کی درس گاہ بالآخر اسے سب کچھ سکھا دیتی ہے، اور ٹھوکریں کھا کھا کر ہی وہ کامیابی کی راہ پر آگے بڑھنے کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ اگر وہ کسی سرپرست کے سہارے جیتا رہے تو ہمیشہ نابالغ ہی بنا رہتا ہے۔

ایسا ہی معاملہ ایک قوم کا بھی ہے۔ وہ بھی کبھی نابالغی کی حالت سے نہیں نکل سکتی جب تک کہ اس امر واقعی سے اس کو سابقہ پیش نہ آجائے کہ اب اپنے'' اچھے بُرے کی وہ خود ذمہ دار ہے، اور اس کے معاملات کا اچھی طرح یا بُری طرح چلنا اس کے اپنے ہی فیصلے پر منحصر ہے۔ آغاز میں وہ ضرور غلطیاں کرے گی، اور ان کا نقصان بھی اٹھائے گی، لیکن صحیح طریقے پر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے کا کوئی راستہ ان تجربات کے سوا نہیں ہے۔ علاوہ بریں جمہوری نظام ہی وہ نظام ہے جو ایک ایک شخص میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ملک اس کا ہے، ملک کی بھلائی اور برائی اس سے وابستہ ہے، اور اس بھلائی اور برائی کے رُونما ہونے میں ذاتی طور پر اس کے اپنے فیصلے کی صحت یا غلطی کا بھی دخل ہے۔ یہی چیز افراد میں اجتماعی شعور پیدا کرتی ہے۔ اس سے فرداً فرداً لوگوں کے اندر اپنے ملک کے معاملات سے دل چسپی پیدا ہوتی ہے، اور اسی کی بدولت بالآخر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ملک کی بھلائی کے لیے کام کرنے اور ملک کو داخلی وخارجی مضمرات سے بچانے میں پورے ملک کی آبادی اپنی پوری طاقت استعمال کرنے لگے۔ دوسرا جو نظام بھی ہو، خواہ وہ بادشاہی ہو یا ڈکٹیٹر شپ یا

اشرافیت، اس میں عوام الناس حالات کے محض تماشائی بن کر رہتے ہیں، اور جب ان حالات کے ردّ و بدل یا بناؤ اور بگاڑ میں ان کی راے اور مرضی کا دخل نہیں ہوتا، تو وہ ان میں دل چسپی بھی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ جمہوریت کے جو اور جیسے بھی نقائص ہوں، انھیں اس نقصانِ عظیم سے بہر حال کوئی نسبت نہیں ہے"۳۵۔

حواشی

۲۱- سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست، جنوری ۱۹۷۲ء، ص ۳۳۰-۳۳۱

۲۲- سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ج۴، ص ۵۱۰

۲۳- علی محمد الصلابی، الشوریٰ فریضۃ اسلامیۃ، ص ۱۱۳، دار ابن کثیر

۲۴- سیّد مودودی، مسلمان خواتین سے اسلام کے مطالبات، ص ۲۲

۲۵- مدخل فی النظریۃ العامۃ للفقہ الاسلامی، ص ۱۰۱، بحوالہ الشوریٰ فریضۃ اسلامیۃ، ص ۱۲۸

۲۶- علی محمد الصلابی، الشوریٰ فریضۃ اسلامیۃ، ص ۱۳۰

۲۷- ایضاً، ص ۱۳۰۔۱۳۱

۲۸- اسلامی ریاست، ص ۱۴۳

۲۹- سنن بیہقی کبریٰ، حدیث ۲۰۱۱۹، مکتبہ دار الباز، مکہ مکرمہ

۳۰- الشوریٰ فریضۃ اسلامیۃ، ص ۱۳۵۔۱۳۶

۳۱- سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، Islamic Law and Constitution، (مرتبہ: پروفیسر خورشید احمد)، ۱۹۶۹ء، ص ۲۸۲-۲۸۴

۳۲- کتاب الاموال، ابو عبید قاسم بن سلام، ص ۱۹۱-۱۹۲، دار الفکر، بیروت

۳۳- حاکم المطیری، تحریر الانسان، ص ۳۲۵-۳۲۷

۳۴- بخاری، حدیث ۳۶۶۸، کتاب بدء الوحی، دار الشعب القاہرہ

۳۵- سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، جولائی اگست ۱۹۵۵ء